خطباتِ اقبالؒ: ایک تحقیقی مطالعہ

جدیدیت و روایت کی کشمکش [قسط ہشتم]

’’فکرِ اقبالؒ تشکیل جدید الٰہیات کے بعد‘‘ ایک مستقل کتاب کا تقاضہ کرنے والا عنوان تھا کیونکہ حضرت علامہ اقبالؒ نے ان خطبات کے بعد مکتوبات، بیانات، تقاریر اور تصریحات میں خطبات سے متعلق امور پر ایسے خیالات متواتر ظاہر کیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خطبات کے بہت سے خیالات سے رجوع کر چکے تھے۔ نذیر نیازی اور علامہ اقبالؒ کی مراسلت تو واضح کر دیتی ہے کہ علامہؒ اپنی زندگی ہی میں خطبات پر نظرِ ثانی کر کے اسے دوبارہ لکھنا چاہتے تھے۔ خطبات سے متعلق بعض خطوط میں اقبالؒ کی تشویش اور اضطراب ان کی دردمندی اور بے چینی کو واضح کرتا ہے۔ یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو لاہور میں خطاب کرتے ہوئے اقبالؒ نے خطبات کے مباحث سے رجوع کا ذکر نہایت لطیف پیرایے میں کیا ’’میں نے اپنی زندگی کے ۳۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصدِ وحید رہا ہے۔ میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اس شکل میں پیش نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسلام موجودہ تمدن کے مقابلے میں ایک کمزور طاقت ہے۔ میری رائے میں اس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے‘‘۔

اقبالؒ کے اس اعتراف کو یا افتادِ طبع کو ستمبر ۱۹۲۵ء میں صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام لکھے گئے خط کی روشنی میں ملاحظہ کیا جائے تو صورتِ حال مزید واضح ہو جاتی ہے۔ اقبالؒ لکھتے ہیں:

میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے نہ تعلیم و تعلّم کی غرض سے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات یہ ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعے میں گزری ہے اور یہ نقطۂ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے، دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطہ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں‘‘۔ اگر مضمون کو عجز و انکسار نہ سمجھا جائے اور اعتراف حقیقت پر محمول کیا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اقبالؒ جو ۱۹۲۵ء میں مذہبی معلومات کے محدود دائرے کا اعتراف کر رہے تھے اجتہاد جیسے مشکل موضوع پر ۱۹۲۲ء میں کیسے مقالہ لکھ لیتے ہیں۔ [۱۹۲۸ء میں اس پر نظرِ ثانی فرماتے ہیں اور اس کی اشاعت کے بعد بھی مسلسل اس پر نظرِ ثانی، ترمیم، تنسیخ کے لیے مضطرب و بے چین رہتے ہیں] خطبات اور خطوط اقبالؒ کے تقابلی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ اقبالؒ نے امام غزالیؒ ابن عربی، اور شاہ ولی اللہؒ کے افکار اور کتب کا براہِ راست مطالعہ کیے بغیر ان ہستیوں کے افکار پر غلط نقد فرمایا یا ان کے افکار سے غلط مطالب اخذ کیے۔ اس سلسلے میں تحسین فراقی اور سہیل عمر کی تحقیقات بہت سے امور واضح کرتی ہیں۔ سلیم احمد نے تشکیل جدید کو جدید اسلام کی انجیل کہا ہے۔ یہ انجیل ان لوگوں کے لیے لکھی گئی تھی جن کے سانچے اور ڈھانچے مغرب کے جدید فکر فلسفے اور سائنس سے شرابور تھے اور جو افادیت پرستی کے نظریے کو روحِ حیات سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر ظفر الحسن نے سرسید کو جدید علم الکلام کا بانی قرار دیا ہے اور اقبالؒ کو اس علم کلام کی جدید اور عمدہ توسیع ظفر الحسن کا یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ سرسید اور اقبالؒ ایک اقلیم کے مسافر نہیں ہیں۔ سرسید قرآن کو کلام اللہ نہیں مانتے، اسے کلام

رسول اللہ مانتے ہیں اور رسالت مآبؐ کو ایک پیغام پہنچانے والا بھی تسلیم نہیں کرتے جب کہ اقبالؒ قرآن حکیم کو آسمان سے نازل ہونے والی وحی اور رسالت مآبؐ کی ہستی کو دنیا کی محبوب ترین ہستی آخر عمر میں اقبالؒ کے عشق رسالتؐ کا یہ عالم تھا کہ جب بھی حضرت اقبالؒ کے سامنے رسول اللہ کا نام لیا جاتا تو آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی۔ظفر الحسن اسلامک ماڈرن ازم اور اسلامک لبرل ازم میں فرق نہیں کرسکے۔ سید سلیمانؒ ندوی نے اس فرق کو نہایت باریک بینی سے واضح کیا ہے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر برعظیم پاک و ہند میں جدید علم کلام کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ اگر یہ ضرورت محسوس ہوئی تو کب، اس ضرورت کے جواب میں متکلمین کے کتنے گروہ پیدا ہوئے؟ کیا ان گروہوں کی تقسیم فارابی کی تقسیم کے مطابق تھی؟ ان متکلمین نے کن سوالات کا جواب دیا اور اپنے اہداف کے حصول میں کس قدر کامیاب رہے؟ یہ بات تو ہمیں معلوم ہے کہ ”علم کلام وہ علم ہے جو کسی بھی مذہبی روایت میں تاریخ کے اس مرحلے پر نمودار ہوتا ہے جب اس مذہب پر ہونے والے مختلف حملے اس بات کی ضرورت پیدا کر دیتے ہیں کہ عقائد دینی کے دفاع کا ایک منظّم طریقہ اختیار کیا جائے۔ متکلمین کا پہلا گروہ مذہب کا دفاع اس نکتے پر زور دے کر کرتا ہے کہ وحی کے ذریعے حاصل ہونے والا علم بہترین انسانی دماغوں کے اکتسابی علم سے برتر ہے۔ دوسرا گروہ مذہب کی حقانیت اس بنیاد پر ثابت کرتا ہے کہ سائنسی علم اور نصوص دین میں مطابقت پائی جاتی ہے۔اقبالؒ متکلّمین کے دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔“ اور سر سید کو کسی گروہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

علم کلام عقائد دینی کو مستحکم طور پر ثابت کرنے کے لیے دلائل دینے اور شبہات کا ازالہ کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے‘ اس اصول کی بنیاد پر ہم برعظیم پاک و ہند میں ظفر الحسن کی تعریف کے مطابق جدید علم الکلام کے دو اہم افراد سر سید اور اقبالؒ کی کلامی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ دونوں نے عقائد دینی کو مستحکم کرنے کے لیے کیا کلامی مباحث پیدا کیے؟ کیا ان دونوں ہستیوں نے عقائد دینی کے دفاع کا کوئی منظّم طریقہ وضع کیا یا چند نئے عقیدے وضع فرمائے اور ان عقائد کی قبولیت سے اسلام اور ملت اسلامیہ کے وجود، بقاء اور تسلسل کو مشروط کر دیا۔ سر سید کے مباحث کے نتیجے میں تو عقائد کمزور ہو گئے۔ اور دین صرف معذرت خواہی اور کاسہ لیسی کا مجموعہ بن گیا۔[سر سید کے نہایت محدود وقتی کلامی مباحث پر مولانا قاسم نانوتوی نے تصفیۃ العقائد اور مولانا اشرف علی تھانوی نے اسلام اور عقلیات میں نہایت عمدہ رد اور نقد کیا ہے۔] اقبالؒ کے یہاں عقائد کی بحث اس قدر فلسفیانہ ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اسے سمجھنے سے قاصر ہیں بلکہ پسر اقبالؒ جاوید اقبالؒ جو یورپ کی جامعات کے فارغ التحصیل ہیں وہ بھی خطبات کی زبان سے استفادہ کرتے ہوئے عاجز ہو جاتے ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ برعظیم کے مسلمانوں کے عقائد پر حملے تو عیسائی مشن، آریا سماج، قادیانی وغیرہ گروہوں کی جانب سے ہوئے تھے، ان حملوں کے سلسلے میں سر سید اور اقبالؒ کے علم کلام سے کیا دفاعی مدد ملی؟ اقبالؒ نے قادیانیت کا موثر جواب انگریزی میں دیا لیکن سر سید نے عیسائیت اور آریائی سماج کے حملوں کا کیا جواب دیا؟ اگر اقبالؒ کا علم کلام صرف خطبات میں مضمر ہے اور شاعری کو اس باب سے خارج کر دیا جائے تو خطبات پڑھ کر مسلمانوں کے عقائد مستحکم ہونے کے بجائے کمزور ہوتے ہیں اور شبہات کا ازالہ ہونے کے بجائے مزید شبہات پیدا ہوتے ہیں بلکہ دین سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ اس اعتراض کا عمومی جواب اقبالؒ کی زبان میں یہ دیا جاتا ہے کہ خطبات کے مخاطب عام لوگ نہیں طبقہ خواص ہے۔ دوسرے لفظوں میں علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے والی اشرافیہ جو ٹائی کوٹ پہننے اور فراٹے سے انگریزی بولنے کو علم کا آخری مرتبہ سمجھتی تھی۔ لیکن خطبات کے ادق عسیر الفہم مباحث اس طبقہ اشرافیہ کی ذہنی سطح سے بھی بہت بلند تھے۔ لہٰذا خطبات کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا۔ اس سے نہ جدید ذہن استفادہ کرسکا اور قدیم ذہن تو ان کو سمجھنے کی استعداد، اہلیت، علمیت رکھتا ہی نہیں تھا، وہ نہ اسے رد کرسکتا تھا نہ قبول نہ اس پر نقد کے قائل تھا۔ پھر خطبات آخر کس کے لیے لکھے گئے؟ یہ اہم ترین سوال ہے۔ اس کا جواب سہیل عمر نے عمدگی سے دیا ہے کہ اپنے لیے لکھے گئے تھے۔ اس میں اقبالؒ سوالات اٹھاتے ہیں اور شاعری میں جواب دیتے ہیں۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ اقبالؒ اور سر سید کے علم کلام نے عقائد دینی کو مستحکم کرنے میں کیا کردار ادا کیا، [انگریزی حکومت کو مستحکم کرنے میں سر سید کے علم کلام نے کلیدی کردار ادا کیا] اس کا جواب بہت سے افسوس ناک حقائق منکشف

کر لے لگا۔ سید سلیمانؒ ندوی کے نام اقبالؒ کے خطوط اس کشمکش کے بین السطور کو نمایاں کرتے ہیں اس کشمکش کی نہایت خوبصورت تصویر سہیل عمر کی کتاب خطبات اقبالؒ نئے تناظر کے آخری باب ''سزا نا سزا'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خطبات اقبالؒ کا ناقدانہ جائزہ لینے کی کوشش عمومی طور پر نہیں کی گئی۔ برعظیم پاک و ہند کے اہم علماء سید سلیمانؒ ندوی، مولانا دریا آبادیؒ، ابوالحسن علیؒ ندوی نے خطبات پر اشاروں کنایوں میں نقد کیا، لیکن واضح تنقید سے گریز کیا۔ اس احتیاط کی بہت سی وجوہات تھیں۔

خطبات اقبالؒ پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئے، ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ سے اس کی دوسری اشاعت شائع ہوئی، تہتّر برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود خطبات اقبالؒ کے سلسلے میں ''حقیقی مطالعات، گہری اور دور رس جرح و نقد اور ضروری توضیحات کی طرف ابھی تک توجہ نہیں دی گئی۔ تشکیل کے حق میں جو کچھ لکھا گیا وہ محض غیر مدلل مداحی سطحی مطالعے اور خوش فہمیوں کا طویل سلسلہ ہے۔ تشکیل کا ناقدانہ جائزہ لینے والوں نے جزوی اقتباسات پر مبنی قیاسات سے تنقید کی عمارت اٹھائی۔ بیشتر لوگ فلسفے کے بنیادی مباحث سے ناواقف ہیں، لیکن اس پر نقد کی جسارت کرتے ہیں۔ ''خطبات کے موضوعات متعین، تحریر فرمائشی اور وسائل مطالعہ و تحقیق صرف آٹھ برس تک محدود تھے۔ لہٰذا شاعری کے آزاد، پائیدار اور تحقیقی وسیلے کے مقابلے میں خطبات زمانے کے فکری اور سیاسی تقاضوں، معاشرتی عوامل رجحانات نفسیاتی ردعمل اور دیگر محرکات کے زیادہ اسیر ہیں۔ لہٰذا یہ سوال خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ اصل چیز اقبالؒ کا شعر ہے یا خطبات اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ خطبات کے بعد کی شاعری خطبات کی ناسخ قرار پائے گی یا نہیں۔ دوسرا زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ شاعری اور خطبات کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ شاعری خطبات کی تابع ہے یا متوازی ہے؟ اگر خطبات اور شاعری متوازی ہیں تو اقبالؒ کی شخصیت مجروح ہوتی ہے۔ جب کہ فی الاصل بات یہ نہیں ہے اس تضاد و اختلاف کی توجیہہ و توضیح کیسے کی جائے یا خطبات و شاعری میں تطبیق کیسے پیدا کی جائے۔ اقبالؒ نثر میں سوال قائم کرتے ہیں، شاعری جواب دیتی ہے لہٰذا اقبالؒ کی شخصیت کا ایک رخ افقی ہے، اسیر تاریخ ہے، دوسرا عمودی ہے، وراء تاریخ ہے، شاعری فاعلی جہت کا ظہور ہے اور خطبات انفعالی سطح کی تجسیم۔''

خطبات اہل علم کے فہم سے ماورا تھے لہٰذا اس سے استفادہ کا دائرہ محدود رہا کیونکہ ''خطبات خالص فلسفیانہ مباحث پر مبنی ہیں اور اس کا اسلوب زبان بیان نہایت پیچیدہ گنجلک اور مشکل ہے۔ بعض نظریات کی وضاحت کے لیے نئی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں اور ان میں الفاظ کی ترتیب مطالب کے فہم و تفہیم کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہے کئی مقامات پر انگریزی زبان میں استدلال ناقابل فہم ہے اور اس کے بار بار تعاقب کرنے سے بھی معانی صاف نہیں ہوتے''۔

خطبات کی تفہیم کے ضمن میں ان مشکلات سے انکار کی گنجائش نہیں، لیکن خطبات اس قدر بھی عسیر الفہم نہیں کہ ان کا توضیحی، تشریحی، تنقیدی جائزہ ایک صدی میں نہ لیا جا سکے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ عالم اسلام میں ایران کے استثنٰی کے سوا فلسفے کی روایت نہایت کمزور ہے۔ خصوصاً برعظیم باک و ہند جسے اقبالؒ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہاں مغربی فلسفہ کے مطالعے اور نقد کی روایت نہایت مجہول ہے۔ پاکستان میں فلسفے کی روایت اس قدر کمزور ہے کہ سہیل عمر نے حسین نصر کی کتاب میں پاکستان میں اسلامی فلسفہ کی روایت پر تین صفحے کا جو مضمون لکھا ہے وہ ہمارے موقف کی تصدیق کے لیے کافی ہے۔

لیکن اس کے باوجود خطبات اقبالؒ کا علوم اسلامی اور علوم مغرب کی روشنی میں ایک مختصر اور تین طویل ناقدانہ جائزے لیے گئے ہیں جو بے مثال ہیں۔ پہلا جائزہ حسین نصر کا مضمون ہے The Westren World Its challanges to Islam۔ اس مضمون میں خطبات پر عمدہ نقد ہے دوسری طویل تنقید ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب ''قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل'' کا آخری باب جدید اسلامی فکر میں اقبالؒ کی اہمیت [۲۱۵ تا ۲۹۲] ہے، انگریزی میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا نقد Iqbal's Reconstruction کے نام سے محفوظ ہے لیکن ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ لیکن خطبات اقبالؒ کا سب سے بہتر عالمانہ اور ناقدانہ جائزہ سہیل عمر کی کتاب ''خطبات اقبالؒ نئے تناظر میں'' کیا گیا ہے۔ ہمارے ناقص مطالعے کے مطابق خطبات اقبالؒ کا اس قدر عمدہ محاکمہ ابھی تک نہیں کیا گیا۔ یہ مقالہ سہیل عمر نے ایم فل کے لیے تحریر کیا تھا اور ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ چھ برس بعد سہیل عمر نے دوسری اشاعت کے موقع

پرحرف مکرر میں تحریر کیا۔ ''گزشتہ آٹھ سال کی اپنی تحقیقات اور اقبالیات میں منظر عام پر آنے والی تازہ تصانیف کی روشنی میں کتاب کے متن اور استدلال میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئیں''، سہیل عمر کا یہ اعتماد ۲۰۰۶ء میں بھی اس طرح برقرار ہے۔ سہیل عمر کا یہ اعتماد اور خطبات پر قیمتی اور موثر نقد کا سرچشمہ روایت کے مکتبہ فکر کی فلسفیانہ اساس ہے۔ جو کائنات، مادہ، روحانیت، تصوف، جدید سائنس، مغرب، مغربی فلسفہ کو ایک نئے اور غیر معذرت خواہانہ تناظر میں دیکھنے کی اہلیت استعداد، روایت اور جرات کے عناصر کا آمیختہ ہے، اس مکتب فکر نے بعض نہایت اساسی اغلاط کے باوجود فکر مغرب پر عالمانہ اور فلسفیانہ نقد کی بے مثال روایت قائم کی ہے۔

کلام اقبالؒ میں ''نیا شوالہ'' موجود ہے اور خطبات اقبالؒ میں بھی کئی نئے شوالے موجود ہیں جن کی نہایت عمدہ نشان دہی سہیل عمر نے کی ہے۔ لیکن ان شوالوں پر نقد نہایت احتیاط، تحمل اور احترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کیا گیا ہے کیونکہ حضرت اقبالؒ ملت اسلامیہ کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان شوالوں کی تشریح نذیر نیازی کی زبانی سنیے: ''میں بیس سال سے خطبات کے مشکل مقامات حل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، یہ وہ مقامات ہیں جو میں نے خود علامہ مرحوم کے سامنے افہام و تفہیم کے لیے پیش کیے تھے لیکن علامہ نے مسکرا کر کر فرمایا کہ نذیر یہ وہ مقامات ہیں جن پر میں خود غور کرتا ہوں تو ذہن پر واضح نہیں ہوتے۔ نہ معلوم کیسی وجدانہ کیفیت میں میں نے یہ باتیں لکھیں، یہ تمام مقامات وجدانی ہیں فکری نہیں وجدان کے ذریعے ہی سے گرفت میں آسکتے ہیں۔ انھیں پڑھتے رہو کبھی تم پر بھی اگر میری جیسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی تو کشف کے طور پر ظاہر ہو جائیں گے لیکن تم محسوس کر سکو گے ان کا اظہار یا ابلاغ نہ کر سکو گے۔ یہ بالکل معرفت کا سا معاملہ ہے۔ افسوس کہ بیشتر مفکرین معرفت کی اس منزل کو پا نہ سکے اور جنھوں نے پالیا وہ مہر بہ لب ہو گئے۔ اس کے باوجود خطبات کو سمجھنے اور سمجھانے کی چند اور کوششیں اہمیت کی حامل ہیں مثلاً،

ڈاکٹر فضل الرحمان نے اپنی کتاب Islam and Modrenity میں خطبات پر بہت مختصر لیکن جامع نقد کیا ہے۔ سید سلیمان ندویؒ کا صرف ایک جملہ خطبات کے نقد میں ملتا ہے۔ اقبالیات ماجد، اور اسلامیت و مغربیت کی کشمکش میں ماجدؒ دریا آبادی اور ابوالحسن علیؒ ندوی کے سرسری تبصرے ملتے ہیں۔ حضرت ابوالحسن علی ندویؒ مغربی فلسفے سے واقف نہ تھے۔ لہٰذا ان کی کتاب اسلامیت و مغربیت کی کشمکش مغرب کے فکر و فلسفے کی تفہیم کے لیے صرف اور صرف محمد اسد کے حوالوں پر انحصار کرتی ہے، اس وجہ سے یہ کمزور ترین کتاب ہے۔ بین السطور سے یہ بات واضح ہے کہ مصنف مغرب کے فکر و فلسفے سے ناواقف ہیں۔ اس کا اعتراف بھی علیؒ میاں نے نہایت فراخ دلی سے فرمایا ہے۔ یہ ان کی عظمت تقویٰ اور للّٰہیت کی علامت ہے۔

مگر اقبالؒ، خطبات اقبالؒ، شعر اقبالؒ، اور تضادات فکر اقبالؒ کے جدید مطالعات میں سلیم احمد، مرزا منور، تحسین فراقی پروفیسر عبدالحمید کمالی کے تنقیدی و توضیحی مضامین کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔

ڈاکٹر عشرت انور کی کتاب Metaphysic of Iqbal اور ڈاکٹر سلمان رشید کی کتاب Iqbal: Concept of God بھی خطبات اقبالؒ کا ناقدانہ جائزہ پیش کرتی ہیں۔ اول الذکر کتاب ڈاکٹر ظفر الحسن کے شاگرد کی ہے اور عمدہ کتاب ہے۔ ثانی الذکر کتاب میں اس خیال کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے کہ کیا اقبالؒ عظیم مذہبی مفکر تھے؟ اقبالؒ کی اس حیثیت کو پہلی مرتبہ موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

ڈاکٹر البھی کی کتاب ''الفکر الاسلامی'' میں علامہ اقبالؒ پر ایک باب میں خطبات کا علوم اسلامی، تفسیر حدیث، فقہ، اجماع کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے اور علامہ اقبالؒ کے تفسیری انحرافات کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن یہ کتاب اقبالؒ کے خطبات کا مغربی فکر و فلسفے کی روشنی میں جائزہ پیش نہیں کرتی۔

حکومت ہند کے پسندیدہ جدیدیت پسند عالم احمد سعید اکبر آبادی جدید مغربی فلسفے سے ناواقف تھے۔ لہٰذا ان کی کتاب ''خطبات اقبالؒ پر ایک نظر'' اقبالؒ کی غیر مدلل مداحی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کتاب کے مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف علم کلام کے قدیم مباحث اور اس کی تاریخ سے بھی ناواقف ہیں۔ اور فلسفہ کلام اور تصوف پر ان کی نظر نہایت سطحی و سرسری ہے۔ عالم اسلام میں جدید

علم کلام کے بانیوں کے مباحث سے بھی وہ لاعلم ہیں۔

ڈاکٹر الطاف احمد اعظمی نے علوم اسلامی کی روشنی میں خطبات اقبالؒ کا ناقدانہ جائزہ پیش کیا ہے، لیکن وہ مغربی علم، فلسفے، جدید سائنس کے مباحث سے ناواقف ہیں، لہٰذا یہ نقد یک طرفہ نظر آتا ہے لیکن اپنے موضوع پر پہلا مفصل اور عمدہ تنقیدی کام ہے لہٰذا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ مستشرقین میں الفریڈ گیوم نے اپنی کتاب Islam اور اے آر گب نے Modren trendsin Islam فکر اقبالؒ کا ناقص ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ ایران میں خطبات کے فلسفیانہ جائزہ کی کوشش ابھی تک ہمارے علم میں نہیں ہے۔ ایران میں خطبات کے ناقدانہ جائزہ کا امکان اس لیے بھی کم ہے کہ ایران کے دانشور مغربی فلسفے سے بے حد مرعوب ہیں اور مغربی فکر و فلسفے اور جدید سائنس کو اسلام کی ہی ترقی یافتہ جدید شکل سمجھتے ہیں۔ ایران فلسفہ میں ہمیشہ آگے رہا ہے لیکن فکر مغرب کا رد ابھی تک سامنے نہیں آیا۔

اقبالؒ نے خطبات محسوس اور معلوم کے خوگر انسان یعنی تجربیت اور افادہ کے سانچے سے ڈھل کر نکلنے والی خلق جدید کے لیے لکھے تھے۔ کیونکہ اقبالؒ سمجھتے تھے کہ اب دنیا میں صرف وہی انسان باقی رہ گیا ہے جو سترہویں صدی کے بعد جدید سائنس اور جدید فلسفے کے ظہور کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اقبالؒ نے مغربی تہذیب اور فکر مغرب کو اسلام کی توسیع ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام اور جدید مغربی فلسفے و سائنس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے سے مثبت طور پر ہم آہنگ ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے مغرب اور اسلام میں تطبیق پیدا کرنے کی جو کوشش کی وہ نہایت پر خطر اور دشوار تھی۔ یہ دو اقالیم کا معاملہ تھا، دونوں کی مابعد الطبیعیات، علمیات، وجودیات، کونیات مختلف تھیں، دونوں کے منہاج مختلف تھے۔ ماخذات علم الگ تھے، مغرب عقل کو واحد ماخذ علم تسلیم کرتا تھا، جب کہ اسلام علوم نقلیہ کو علوم کا ماخذ تسلیم کرتا ہے پھر ان دونوں میں تطبیق کیسے ممکن ہے؟ اس تطبیق کے نتیجے میں اقبالؒ کو نئے شوالے، نئے فکری تبکدے تعمیر کرنے پڑے۔ مثلاً

☆ اقبالؒ واردات باطنی کو احتمال خطا کے باوجود ذریعہ حصول علم تسلیم کرنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس احتمال کا رد کرنے کے لیے وحی نبوی میں احتمال خطاء کا امکان تسلیم کر لیتے ہیں اور اس کے لیے قرآن کی آیت سیاق و سباق سے کاٹ کر غلط استدلال فرماتے ہیں۔ خطبہ علم بالحواس و بالوحی میں وہ فلسفی اور پیغمبر کو نتائج کے لحاظ سے ایک مقام پر فائز فرما دیتے ہیں:

The pragmatic test judges it by its fruit. The former is applied by the philosopher the later by the prophet.

''اس تحریر کی تنقیح کی جائے تو بہت سے انبیاء ناکام ترین لوگ ٹھہرتے ہیں اور ان کی نبوت اور وحی شک و شبہ میں پڑ جاتی ہے [نعوذ باللہ] ☆ اقبالؒ عبادت، دعا، کو نتائجیت سے مشروط کر دیتے ہیں اور ان کے روحانی افادات کے بجائے ان کے مادی ثمرات و نتائج کو اصل اہمیت دیتے ہیں۔ وہ عبادت کی فی نفسہ اور بالذات قدر و قیمت کے بجائے اس کے سماجی نفسیاتی اور علمی نتائج کو مقدم جانتے ہیں جنھیں ضمنی و ذیلی اثرات تو تصور کیا جا سکتا ہے لیکن مقصود اصلی نہیں۔ ☆ علامہ اقبالؒ کے تصور خودی کے باعث ''وجود خداوندی خودی کے وجود محدود میں گم ہو جاتا ہے اور وہ اس خودی کے پہلو بہ پہلو الگ وجود رکھنے کے بجائے ایک امکان نادمیدہ یا ظہور کے ایک بروز نایافتہ امکان کے طور پر باقی رہتا ہے اور اس طرح علم ربانی خودی کے علم میں غائب ہو جاتا ہے''۔ ☆ اقبالؒ برزخ حشر اجساد جنت وجہنم کی حیاتیاتی تعبیر کو ممکن بنا کر ان کے وجود کو محض، یانی اور تصوراتی قرار دے کر اسلامی علمیات عقائد، نظریات سے مکمل انحراف کرتے ہیں۔

☆ ان کے یہاں برزخ انتظار اور توقف کی انفعالی حالت نہیں بلکہ خودی کا وہ عالم جس میں اسے حقیقت مطلقہ کے بعض نئے پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے اور جن سے تطابق و توافق کے لیے اسے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ برزخ میں بعض بدقسمت انسان اپنی ہستی کھو بیٹھیں گے، خودی کو بہرحال اپنی جدو جہد جاری رکھنا ہے تا کہ اس میں حیات بعد الموت کے حصول کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ دراصل بعث بعد الموث کوئی خارجی حادثہ نہیں۔ یہ خودی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے۔ ☆ جنت و دزخ احوال ہیں مقامات یعنی کسی جگہ کے نام نہیں، قرآن میں ان کے بیان سے مقصود یہی ہے کہ داخلی حقیقت یعنی انسان کے اندرونی احوال کا نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر

جائے۔☆ بہشت کا مطلب ہے فناء اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرت، جہنم بھی کوئی ہاویہ نہیں، جسے کسی منتقم خدا نے اس لیے تیار کررکھا ہے کہ گناہ گار ہمیشہ اس میں گرفتار عذاب رہے، وہ درحقیقت تادیب کا ایک عمل ہے۔ تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہوگئی ہے وہ پھر رحمت خداوندی کی نسیم جان فراء کا اثر قبول کرسکے۔ اقبالؒ کے یہ خیالات اسلامی علمیات اور مسلم علم کلام کے لیے کیا قابل قبول ہیں؟ منکرین خدا اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں کہ عالم عقبیٰ میں کچھ نہیں ہوگا۔ حشر ونشر فریب ہے اور جزاء وسزا واہمہ ہے انھیں آخرت میں کسی چیز کی توقع نہیں، کیا اقبالؒ ان منکرین سے متاثر ہیں؟''

☆''اقبالؒ کا تصور ختم نبوت جو پانچویں خطبے کا موضوع ہے نبی کو ایک نابغہ سے تشبیہہ دیتا ہے اس کے نتیجے میں بنی ایک سماجی مصلح یا تخلیقی فنکار سے زیادہ مشابہہ معلوم ہوتا ہے اور اسے خدا کے حوالے کے بغیر بھی کائنات کے لیے استعمال کرنا ممکن ہے۔ وحی کے بارے میں اقبالؒ کہتے ہیں کہ یہ خاصہ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی......اس تصور کے نتیجے میں وحی فوق الطبعی اور عالم غیب کی چیز نہیں رہتی بلکہ ایک کا ملاً طبعی مظہر بن جاتی ہے، جب کہ وحی کو اس مقام اور سطح پر پہنچادینا صرف جدیدیت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔☆ اقبالؒ کے خیال میں جدید سائنس علم کے ایک خاص طریقہ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ سائنسی طریقہ کار استقراء ہے۔ یعنی عالم طبیعی کی صرف ایک ہی طرح کی سائنس ممکن ہے اور یہ سائنسی علم اسی طریقے سے حاصل ہوتا ہے جسے سائنٹفک میتھڈ کہتے ہیں۔ یہ بالکل غلط خیال ہے اس خیال کی لغویت کمزوری، حسین نصر نے An introduction to the Islamic consmological Doctrin اور Refelection on onMethodology in the Islamic Science میں نہایت موثر طریقے سے ثابت کردی ہے۔ اسلام میں سائنس کے حصول کے مختلف طریقہ کار رہے ہیں، اسے صرف ایک خاص طریقے سے مشروط کرنا درست نہیں۔ جدید سائنس چونکہ مغرب کے تصور علم و مابعد الطبیعیات سے نکلی ہے۔ لہٰذا یہ زماں ومکاں میں محصور ہے اور اس کا ظہور صرف اور صرف ایک خاص طریقے سے ممکن ہے۔ اس کا اطلاق وانطباق اسلام کے طریقۂ علم پر نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی کوئی ایک منہاج علم ایسا نہیں جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاسکے کہ یہ مسلمانوں کا امتیازی منہاج ہے۔ مسلمان اہل علم کئی طریق کار استعمال کرتے رہے، مغربی کے سائنٹفک میتھڈ کو واحد طریقہ قرار دینا درست نہیں۔''

☆ اقبالؒ نے ابن عربی، شاہ ولی اللہ کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا تھا۔ [اس سلسلے میں سہیل عمر اور تحسین فراقی کے مقالات میں تمام حوالے دستیاب ہیں] دوسروں کے حوالوں سے مقدمہ قائم کیا تھا۔ یہی حال خطبات میں غزالی کے حوالوں کا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ایک مصنف کا غلط حوالہ غزالی کے نام سے خطبات میں پیش کردیا جب کہ مذکورہ مصنف نے المنقذ من الضلال کو احیاء العلوم الدین سے خلط ملط کردیا، اسی بنیاد پر اقبالؒ نے غزالی کو ڈیکارٹ کا پیش رو قرار دے دیا جب کہ المنقذ میں کوئی ایسی عبارت نہیں ملتی جو ڈیکارٹ کی تشکیک ماہئیت علم اور نفس علم کے بارے میں ہے۔ ڈیکارٹ کا خیال تھا:

It is necessary once in one's life to doubt all things, so far as this is possible.

غزالی کبھی بھی مذہبی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ غزالی کی تلاش وتحقیق کو ڈیکارٹ اور مغربی فلسفے کی ارتباتیب سے مشابہہ قرار دیتا، غزالی کے براہ راست مطالعے سے محروم رہنے کا شاخسانہ ہے۔

سید سلیمانؒ ندوی نے اقبالؒ کی ایسی اغلاط پر روشنی ڈالی ہے۔

☆ اقبالؒ نے ساتویں خطبے ''کیا مذہب کا امکان ہے؟'' میں ''مذہبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے [۱] ایمان [۲] فکر [۳] معرفت۔ پہلے دور میں لوگ مذہب کو بے چون و چرا قبول کرتے ہیں، وہ مذہب کی حکمت اور مصلحت سے لاتعلق رہتے ہیں۔ لیکن اس طریقے سے افراد کے اندرونی نشوونما اور وسعت ذات پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اس دور اطاعت کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب عقلاء مذہب پر غور کرتے ہیں اور اس کے سرچشمہ حقیقی کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ایسی مابعد الطبیعیات کی جستجو کرتے ہیں جو اس معرفت کے لیے اساس کا کام دے سکے۔ تیسرے دور میں مابعد الطبیعیات کی جگہ نفسیات کے لیے خالی ہوجاتی ہے اور انسان آرزو کرتا ہے کہ حقیقت مطلقہ

سے براہ راست اتحاد و اتصال قائم کرے۔ یہی مرحلہ ہے جب مذہب زندگی اور طاقت و قدرت کا معاملہ بن جاتا ہے۔

اقبالؒ نے یہاں مذہب کو عطیہ ربانی اور آسمانی تحفہ کے بجائے طبعی طور پر نمودار ہونے والی شے قرار دیا ہے جو اپنے آخری دور میں انتہائے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن یہ استدلال درست نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام جو خیر القرون میں موجود تھے۔ مذہب کی حکمت، حقیقت اور معرفت سے محروم تھے، اس نقطہ نظر سے خیر القرون قرنی'' کی حدیث اور دیگر ارشادات نبوی کی نفی ہوجاتی ہے کیونکہ اقبالؒ کے اس فلسفے کے باعث خیر القرون تو تیسرے مرحلے میں بتدریج آتا ہے لہٰذا ''بہ اعتبار وسعت ذات اور اندرونی نشو ونما'' مولانا روم، شاہ ولی اللہؒ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ سے فائق تر ہوجاتے ہیں۔'' [نعوذ باللہ]

مذہب کو تین ادوار میں تقسیم کرنے کا اقبالی فلسفہ حدیث سنت اور قرآن کریم [ثلة من الاولين و قليل من الاخرين] سے براہ راست متصادم ہے۔ یہ نقطہ نظر فضیلت صحابہ کی بھی نفی کر دیتا ہے اور بعد کے زمانے میں آنے والوں کو خیر القرون پر فائق برتر اور اعلیٰ تصور کرتا ہے، اس کے نتیجے میں حفظ مراتب کی وہ فہرست تہس نہس ہوجاتی ہے جو اسلامی کونیات [Cosmology] کا لازمہ ہے۔ مذہبی زندگی کا دور تفکر تو ایمان وایقان کے ضعف کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے اور معاشرہ اپنے سرچشمہ فیض کی عقلی توجیہہ تلاش کر کے زوال کے عمل کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبالؒ کے خیال میں کانٹ کے برعکس مذہب اور فلسفے کا مسئلہ مشترک ہے۔ اقبالؒ کی نظر میں نفسیاتی خلل سے مملو شخصیت [Pcycopath] [نعوذ باللہ] رسولؐ کی بدولت غلاموں کے اندر وہ صفات پیدا ہوئیں کہ انھوں نے دنیا کی امامت و رہنمائی کا فریضہ ادا کیا اور جن کے زیر اثر قوموں اور نسلوں کے اخلاق و کردار اس طرح بدلے کہ ان کی زندگی نے ایک بالکل نئی شکل اختیار کرلی۔ دوسرے لفظوں میں نبوت کا اصل فریضہ لوگوں کو امامت و رہنمائی کے لیے تیار کرنا اور صرف اخلاق و کردار بدلنا ہے۔ اصل فریضہ بندگی رب اطاعت رب اور فکر آخرت فرائض نبوت میں اقبالؒ کے یہاں ثانوی درجے میں بھی نظر نہیں آتے۔ اقبالؒ پیغمبر کے بارے میں مغربی تصور نفسیات سے مرعوب ہوتے ہوئے قرآن کے دعویٰ وما صاحبکم بمجنون'' کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ مغربی طریق استدلال طرز کلام کے مطابق مغرب کو مطمئن کرنا چاہیے، خواہ اس کے نتیجے میں رسالت مآبؐ کی ہستی مجروح ہوجائے، وحی الٰہی کا مقصد ختم ہوجائے اور منصب رسالت کے اصل تقاضے پس منظر میں چلے جائیں، وہ نطشے کو ''بنی آسا'' قرار دیتے ہیں اور اس کی شخصیت میں وہ جھلک دیکھتے ہیں جس کی بدولت اس میں پیغمبرانہ ذہنیت اقبالؒ کو نظر آنے لگی:

I call his vision imperative because it appears to have given him a kind of prophetic mentality which by some kind of technique aims at turning its vision into permanent life force.

یہ الفاظ اقبالؒ اس شخص کے لیے ادا کر رہے ہیں جس نے خدا کی موت کا اعلان کیا۔ عہد حاضر کا پوسٹ ماڈرن ازم اس کے فلسفہ جبلت اور جمالیات پر کھڑا ہے، جسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے میں محبوس کیا گیا تھا۔ آج مغرب کی تہذیب نطشے کے فلسفہ جبلت اور جمالیات کے محور پر گردش کر رہی ہے زندگی کو لطف و لذت کے سوا کچھ نہ سمجھنے والا نطشے اقبالؒ کو پیغمبرانہ شان کا حامل نظر آتا ہے۔

اقبالؒ نے جس قلم سے خطبات لکھے اسی قلم سے جاوید نامہ بھی لکھا۔ جاوید نامہ ۳۲۔۱۹۲۷ء کے درمیان لکھا گیا۔ یہی خطبات کا دور تحریر ہے۔ کیا جاوید نامہ خطبات کا ناسخ ہے یا خطبات کی توضیح و تشریح اور تمام مذاہب ادیان اور نقطہ ہائے نظر کے وحدت کی علامت اس بارے میں ایک ماہر اقبالیات کا کہنا ہے کہ ''اقبالؒ ایک نیا فلسفہ پیش کر رہے تھے۔ جسے یونیورسل سوشل ری کنسٹرکشن کا نام دیا جاسکتا ہے۔ جاوید نامہ میں تمام مذاہب عالم، ادبیات کی تمام عالمی روایات، تہذیبوں کے تمام دھارے اور تمام عالم کی اہم شخصیات مجتمع ہیں۔ جس کا حالیہ مظہر مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے مابین مکالمے کا آغاز اور پل کی تعمیر ہے''۔ اگر ماہر اقبالیات کا یہ بیان صحیح ہے تو فکر اقبالؒ پر ایک اور ناقدانہ نظر کی ضرورت ہوگی۔

ساحل جون ۲۰۰۶ء